جدید عربی نثر کے ارتقائی مراحل

(۳)

ڈاکٹر محمد راشد ندوی

اس سے پہلے ہم دوسرے دور کے ادیبوں اور فنکاروں کے فکروفن اور ان کے عزم وحوصلہ پر تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ جس میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ ان حضرات نے مغرب ومشرق کے علم وادب اور فکر وثقافت کے درمیان جو حسین امتزاج پیدا کیا تھا اس کی وجہ سے زبان وبیان کا معیار اور اس کی سطح بلند سے بلند تر ہو گئی تھی۔ اور ابھی پچاس سال کا عرصہ بھی پورا نہیں ہونے پایا تھا کہ ان کی محنتوں اور کاوشوں کی بدولت عربی زبان کی عالمی حیثیت متعین ہو گئی تھی اور دوسرے انھوں نے زبان وبیان کا ایسا متوازن ہنج قائم کر دیا کہ بعد کے لوگوں کے لیے ہر طرح کا کام کرنے کے لیے زمین ہموار ہو گئی۔ لیکن جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کسی زبان کی عظمت اس میں نہیں ہے کہ وہ عروج کی منزلوں تک پہنچ جائے اور لوگ اس کو دیکھ کر خوش ہوں اور اس پر راضی ہو جائیں۔ بلکہ زبان کی عظمت وترقی کا راز اس میں ہے کہ ہر روز اس میں نئی معلومات کے اضافے ہوں اس میں جدید سے جدید جذبات ورجحانات کی عکاسی ہو۔ ریسرچ اور تنقید کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر لوگوں کی نظر ہو اور زندگی کے مسائل سے زبان کو ہمکنار کرنے کی مساعی ہوں۔ اگر یہ چیزیں کسی زبان میں موجود ہیں تو اس زبان کا کارواں کسی منزل پر رکتا نہیں بلکہ ہر لمحہ اس کے سامنے نئی منزل ہوتی ہے۔ جدید عربی زبان وادب کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ دوسرے

دور کے ادیبوں اور مصنفوں نے ان کو آگے بڑھانے اور پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کوتاہی نہیں کی بلکہ ان کے عزم و حوصلہ، محنت و جستجو، ان کے بزرگوں اور استادوں کے مقابلہ میں کسی طرح کم نہیں تھے۔ دوسرے ان حضرات کے لیے جیسے حالات اور فضا میسر تھی ان کے بیشترو اس سے محروم تھے کیونکہ دوسرے دور کے ادیبوں نے مغرب کے سرمایہ کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی اور دوسرے وہاں کے بہت سے ادبی اور تنقیدی نظریات ان حضرات کے ذریعہ عربی زبان میں آئے جن کو عربی زبان سے مناسبت نہیں تھی اور انھوں نے مغرب کے بہت سے ایسے تاریخی اور تنقیدی نظریات کو مسلم حقیقت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا لیکن بعد میں ریسرچ اور تحقیق کی کسوٹی پر جب انھیں پرکھا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ جن بنیادوں پر یہ نظریات قائم تھے وہ بنیاد ہی غلط تھی چنانچہ تیسرے دور کے ادیبوں محققوں اور فنکاروں نے جہاں عربی زبان و بیان میں نئی چیزوں کا اضافہ کیا وہیں انھوں نے اپنے بزرگوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی کی اور عرب نوجوانوں کو حقائق کی روشنی میں جو باتیں انھیں نظر آئیں ان سے ان کو باخبر کیا۔ اور یہی درحقیقت ہر زبان کی ترقی اور اس کی عظمت کی علامت ہے۔ اور اسی بنیاد پر کارواں سے کارواں بنتا ہے اور چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔

اس مقالہ میں ہم تیسرے دور کے ادیبوں، محققوں اور فنکاروں کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کا ذکر کریں گے اور اس میں جو نئی فکر یا اسٹائل ہمیں نظر آئے گا ان کی طرف اشارہ بھی کریں گے تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو سکے کہ عربی زبان و بیان ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ اور دوسرے مرحلے سے تیسرے مرحلہ تک کس طرح آگے بڑھتی رہی۔

تیسرے دور کے ادیبوں میں علامہ محمود شاکر، پروفیسر شوقی ضیف، پروفیسر خلف اللہ، ڈاکٹر ناصر الدین الأسد، عمر الدسوقی، عسکری نعیل، امجد الطرابلسی، خلیل مردم قابل ذکر ہیں۔ ان کی تحریریں تنقید و تحقیق کے میدان میں بہت اہم قرار دی جا سکتی ہیں۔ ان حضرات نے جدید موضوعات سے لے کر قدیم عربی ادب کے سرمایہ کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس سے عربی ادب اور نثر نگاری کی رفتار کافی تیز ہوئی۔ ان کی تحریروں میں جہاں جدید مسائل اور نئے نئے موضوعات پائے جاتے ہیں

رہیں ان میں ان کے اساتذہ کے تجربوں اور ان کے تنقیدی نظریات کی کہیں کہیں جھلک بھی ملتی ہے اور کہیں کہیں ان کے بتائے ہوئے علمی اور تحقیقی نظریات و افکار پر تنقید یں بھی کی گئی ہیں اور دلائل سے انھیں غلط ثابت کیا ہے، جو درحقیقت علمی استقلال، آزادیٔ فکر طلب و جستجو کی علامت ہے، جن کی بدولت علم و ادب کا قافلہ ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔ اختصار سے ہم ان کے تحقیقی و تنقیدی کارناموں کا جائزہ لیں گے تاکہ اس عہد کی صحیح تصویر ہمارے سامنے آسکے اور ہم خود کوئی فیصلہ کرسکیں۔

علامہ محمود شاکر: علامہ محمود شاکر مصر کے ایک علمی اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے ان کے دادا محمد شاکر کا مصر کے سیاسی و مذہبی حلقوں پر بڑا اثر تھا وہ شیخ محمد عبدہ کے معاصرین میں تھے، محمد شاکر جامعہ ازہر میں (وکیل) یعنی نائب شیخ الازہر تھے۔ بعد میں ترقی کر کے حکومت سوڈان کے عدالت عالیہ کے چیف جسٹس بھی ہو گئے تھے۔ محمد محمود شاکر کی ابتدائی تعلیم مصر کے سرکاری اسکولوں میں ہوئی، اعلیٰ تعلیم کے لیے قاہرہ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی میں داخلہ لیا، یہ وہ زمانہ تھا جب ڈاکٹر طہٰ حسین فرانس سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے مصر واپس ہوئے تھے اور قاہرہ یونیورسٹی میں عربی کے استاد مقرر ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے تدریسی فرائض کے لیے دور جاہلی کے ادب و شاعری کا انتخاب کیا، چنانچہ انھوں نے اس موضوع پر لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا۔ جاہلی دور کی شاعری اور ادب کا مسئلہ بڑا نازک ہے۔ وہ فرانس سے تعلیم حاصل کر کے واپس ہوئے تو ان کے اندر تجدیدی رجحانات کا بڑا اثر تھا اور وہ خود بھی اپنا سکہ نئے ذہن پر منوانا چاہتے تھے۔ طہٰ حسین کو فن تحریر و تقریر پر دونوں پر یکساں ملکہ تھا یعنی وہ جتنے اچھے انشاء پرداز تھے اتنا ہی وہ کامیاب استاد تھے۔ ان کی گفتگو کا انداز بڑا دل نشین تھا اور زبان بڑی پیاری استعمال کرتے تھے یادداشت غضب کی تھی جاہلی دور کی شاعری اور اس کی خصوصیات اور تاریخی پس منظر پر وہ اپنی گفتگو کا سلسلہ ختم کر دیتے تو اس وقت زیادہ مناسب ہوتا لیکن انھوں نے ایک قدم آگے بڑھانے کی کوشش کی وہ یہ کہ جاہلی دور کی شاعری کی حیثیت ایک افسانہ سے

زیادہ نہیں ہے۔ اموی اور عباسی دور کے راویوں نے اپنی علمی اور ادبی فوقیت ثابت کرنے کے لیے زیادہ تر اشعار وضع کیے ہیں اور انھیں جاہلی دور کے نام نہاد شعراء کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ ان کے لیکچروں کا یہی محور و مرکز تھا، استاد محمود شاکر طٰہٰ حسین کے شاگرد تھے لیکن علمی ماحول میں ان کی نشو و نما ہوئی تھی، آسانی سے طٰہٰ حسین کے افکار و نظریات کو تسلیم نہیں کر لیتے۔ چنانچہ استاذ و شاگرد میں بحث و مباحثہ ہوتا رہا اور دونوں استاد و شاگرد کے بجائے کلاس میں ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ محمود شاکر نے احتجاجاً یونیورسٹی کی تعلیم ختم کر دی ان کا علمی شوق یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اور زیادہ بڑھا۔ انھوں نے والہانہ اور عاشقانہ انداز میں عربی زبان کے اصول و مراجع و اسلامی علوم و فنون کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ ان کے والد کا کتب خانہ بہت بڑا تھا لیکن اس پر انھوں نے اکتفا نہیں کیا، بلکہ عربی زبان و ادب تفسیر و تاریخ کے موضوع پر جس کتاب کا انھیں پتہ چلتا اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کا ذاتی کتب خانہ مصر کے اہم اور نادر کتب خانوں میں شمار ہونے لگا۔ ان کی زندگی کا مقصد مطالعہ ہی بن گیا۔ انھوں نے عربی علوم و فنون کا مطالعہ جس لگن و انہماک سے کیا جدید دور میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے، جہاں ان کا مطالعہ وسیع اور متنوع تھا وہیں ان کی نظر بڑی گہری اور ناقدانہ تھی افسوس اس بات کا ہے کہ عصر جدید کے علم و ادب کا بحر بیکراں اتنا بے نیاز بلکہ زمانہ سے بیزار رہا کہ اس کے تحقیقی و تنقیدی نظریات و افکار سے لوگ محروم رہے۔ ان کی مجلسوں میں بیٹھنے والا ان کی علمی گفتگو سے اپنے علم کی جھولی بھر کر اٹھتا اور کتنے ہی، جو ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے رہے آج علمی و ادبی دنیا میں ان کا طوطی بول رہا ہے، ان کی زندگی کا مقصد پڑھنا اور مطالعہ کرنا رہا اس لیے تحقیقات کی طرف انھوں نے توجہ کم کی، کبھی کبھی ان کے خاموش سمندر میں طغیانی ضرور آئی اسی وقت ساحل پر شور الاماں ہو گیا، استاذ کا قلم اسی وقت اٹھتا جب ان پر کوئی نفسیاتی رد عمل ہوتا۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا کہ ان کا قلم علم و ادب کے میدان میں مچل رہا ہے اور ادب و انشاء کے [illegible]تے

ابل رہے ہیں۔ جذبات کا طوفان ہے لیکن ہر لفظ میں ہزاروں صفحات کا نچوڑ اور ہر فکر تاریخی حقائق کا مرقع۔ انھوں نے مصر کے علمی اور ادبی جرائد و مجلات میں وقتاً فوقتاً بہت کچھ لکھا، اور مقالات بہت ہی قیمتی اور دقیع ہیں۔ لیکن ان کے ادبی اور تحقیقی تجربات کا نچوڑ ان کی معرکۃ الآرا کتاب ''حیات المتنبی من شعرہ'' (متنبی کی زندگی اس کی شاعری کی زندگی میں) یہ کتاب ادب وتنقید کی دنیا میں ایک معجزہ ہے۔ متنبی پر ہر زمانہ اور علاقہ میں بہت کچھ لکھا گیا اور ان پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہے۔ جیسا کہ ہر بڑے شاعر کا معاملہ ہے کیونکہ اس کے فکر و فن کے بہت سے گوشے صیغۂ راز میں رہتے ہیں جو وقتاً فوقتاً کسی صاحب ذوق پر منکشف ہوتے ہیں۔ اسی طرح تنقید و تحقیق، انکشاف و ایجاد کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ قدما نے جو کچھ متنبی کی موافقت اور مخالفت میں لکھا وہ بھی محفوظ ہے نئے دور میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین، عزام پاشا، بلاشیر، علامہ عبدالعزیز میمنی نے اپنے فکر و مطالعہ کے مطابق متنبی کی زندگی سے لے کر اس کے فکر و فن کو اجاگر کیا۔ سب کے یہاں کچھ نہ کچھ انفرادیت پائی جاتی ہے۔ علامہ محمود شاکر نے متنبی کے کلام کو ایک وحدت میں دیکھنے کی کوشش کی، اس کی شاعری میں جو ہیجان، بے اطمینانی، سوز و کرب کی کیفیت ہے اس کے اسباب کو جاننے کی کوشش کی۔ اس کے کلام کے ایک ایک لفظ کا انھوں نے ناقدانہ اور عالمانہ مطالعہ کیا۔ متنبی نے کہیں اپنے بارے میں اور کہیں اپنے معاصرین کے بارے میں جو تذکرہ کیا ہے اس کے پس منظر کو عباسی دور کی تاریخ و تذکرہ اور ادب و تنقید کی کتابوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی، پھر وہ لوگ جن کا متنبی نے تذکرہ کیا ہے ان کی ذاتی زندگی کو سمجھنے کے لیے علامہ شاکر نے عباسی دور کے علمی اور ادبی صحیفوں کا بھی جائزہ لیا، ان کا خیال ہے کہ فنکار کی نفسیات، اس کے ذاتی احساسات، وجد و کیف پر بھی کبھی خارجی عوامل اور کبھی داخلی عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر خارجی عوامل و محرکات کا سراغ لگ جائے تو داخلی عوامل کی تہوں تک پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس دھن و لگن سے انھوں نے متنبی کو پڑھنا شروع کیا۔ اپنے خیالات و نتائج کی جمع و ترتیب میں انھوں نے جو جوہر دکھلائے وہ جدید عربی نثر نگاری

میں انوکھے ہیں۔ لفظوں اور جملوں میں دلی کیفیات و جذبات متحرک نظر آتے ہیں جس طرح خود متنبی کے کلام میں زندگی رواں دواں رہتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ کسی فنکار نے اس عظیم شاعر کی زندگی اور اس کے کلام کی تصویر اس انداز میں بنائی اور مرتب کی ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کر رہا ہے کہ خود شاعر اپنی کہانی اپنی زبانی سنا رہا ہے۔ اور زندگی کے ہر موڑ پر جہاں سے اس کی کچھ امیدیں وابستہ رہی ہیں اپنے احساسات کو اسی وجد و کرب کے عالم میں دُہرا رہا ہے۔ متنبی کو جہاں اپنے زمانہ کے حقائق پر پوری نظر تھی وہیں وہ اپنے معاصرین کی سازشوں، ان کے ظاہر و باطن سے بھی واقف تھا۔ چنانچہ وہ کبھی ان لوگوں کا مسکراتے ہوئے تذکرہ کرتا ہے تو اس کی مسکراہٹ تیر و نشتر کا اثر ہوتا ہے۔ اس کی ہجو کا نشانہ یقیناً کچھ لوگ ہوتے ہیں لیکن اس کی ہجو میں ذاتیات سے زیادہ اشخاص کے کیرکٹر مقصود ہوتے ہیں۔ استاد شاکر نے متنبی کے ظاہر و باطن کو جس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ایسا لگتا ہے ان کو متنبی سے عشق ہے۔ اس کے ہر ہر لفظ میں ایک کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ جس طرح عاشق کو معشوقہ کی ہر ادا میں زندگی و بہار نظر آتی ہے اور اس کی ہر یاد اس کی یادداشت کے چشمہ میں اُبال پیدا کر دیتی ہے۔ استاد شاکر نے اس عظیم علمی و ادبی عمل کو اس والہانہ اور عاشقانہ کیفیت کے ساتھ مرتب کیا ہے اور یہ کتاب ایک اعلیٰ فن کار کا مرقع بن گئی ہے۔ اور اب تک متنبی پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس نے ان کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ الجزائر کے مشہور عالم اور مفکر مالک نبی کی کتاب "الظاھرۃ القرآنیۃ" پر محمود شاکر نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ اگرچہ بہت طویل نہیں ہے لیکن اتنا جامع ہے کہ اس سے اعجاز القرآن کا پورا تصور واضح ہو جاتا ہے۔ محمود شاکر جاہلی دور کی شاعری کے دلدادہ ہیں، اور عربوں کو فن بلاغت پر فطری طور پر عبور تھا اور قرآن کے اعجاز کو صحیح معنوں میں سمجھ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اس کا اظہار نہ کیا ہو لیکن اس سے متاثر تھے بلکہ ان میں جو بھی اسلام قبول کرتا اس کا فریضہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بقول اُن کے جاہلی دور کی شاعری پر اگر کسی کا صحیح مطالعہ نہیں تو وہ قرآن کا اعجاز سمجھنے سے قاصر ہے۔ اعجاز کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لیے کسی منطقی طرز بیان کی ضرورت

نہیں بلکہ اعجاز قرآن پر وہی قلم اٹھائے جس کے رگ و ریشہ میں قرآن کا اسٹائل رواں دواں ہو اور وہ اس سے محظوظ ہو رہا ہو۔ علامہ شاکر نے جس انداز میں اعجاز القرآن پر گفتگو کی ہے اس میں ان کی عالمانہ شان کے ساتھ ادیبانہ اور شاعرانہ ذوق بھی جلوہ گر ہے۔

محمود شاکر نے جہاں ادبی و تنقیدی موضوعات پر لکھا ہے وہاں ان کے قلم و فکر کے جوہر فن تحقیق میں بھی کھلے ہیں۔ 'طبقات محول الشعراء'، تفسیر طبری کی تحقیق و تخریج، اس موضوع پر یہ دونوں کتابیں ہر محقق کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔

ڈاکٹر شوقی ضیف: پروفیسر شوقی ضیف نے جدید عربی نثر نگاری میں اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے۔ وہ قاہرہ یونیورسٹی میں عربی ادب کے استاذ رہے ہیں، ان کی زندگی کا مقصد تدریس و تالیف ہی رہا۔ عربی ادب کے استاذ کی حیثیت سے انھیں بہت سے علمی اور تنقیدی موضوعات سے دوچار ہونا پڑا چنانچہ مختلف موضوعات پر وقتاً فوقتاً ان کی تصانیف منظر عام پر آتی رہیں۔ جاہلی دور سے لے کر جدید دور تک جو اہم اور بنیادی مسائل عربی زبان و ادب میں پیدا ہوئے ان کا شوقی ضیف نے عالمانہ اور ادیبانہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر شوقی ضیف، ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے خاص شاگردوں میں ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے پر فخر و ناز ہے شوقی ضیف ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے طرز تحریر و انشاء سے بہت متاثر ہیں اور اپنی علمی زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں ان کے طرز بیان کی تقلید کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن ان کو اس میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ طٰہٰ حسین جس طرز تحریر کے موجد ہیں وہ ان کی ذات ہی سے وابستہ ہے اس میں ان کے مزاج و نفسیات کا دخل زیادہ ہے۔ اگرچہ وہ فرانسیسی ادب سے بہت متاثر ہیں جس میں ایجاز کے بجائے اِطناب کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے لیکن مسئلہ صرف ایجاز و اطناب کا نہیں ہے بلکہ الفاظ کا ہے جس کو قالبوں اور سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے الفاظ کے ساتھ افکار و جذبات بھی ڈھل جاتے ہیں۔ اس کے کسی بھی اسٹائل کی تقلید و نقالی ضیاع وقت کے مترادف ہوتی ہے۔ طٰہٰ حسین نابینا ہیں عام طور سے اس طرح کے ادباء اپنی بات کو بہت زیادہ پھیلانے کی

کوشش کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی معلومات کا ذخیرہ دوسروں کے مقابلہ میں کم ہوتا ہے۔ اس لیے ایک بات کو مختلف طریقہ سے بیان کر کے منوانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے طہٰ حسین جن موضوعات پر لکھتے ہیں ان پر کافی غور و خوض کرتے ہیں اور جس مسئلہ کی وضاحت کرنا چاہیے اس کو پوری طرح ہضم کر کے قلم اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے افکار و خیالات کا بہت ہی مستحکم تسلسل ہوتا ہے اور پوری کتاب ایک وحدت میں ڈھل جاتی ہے شوقی ضیف اپنے استاذ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے رہے ان کو اپنے استاذ کے اسٹائل کی تقلید میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی لیکن انھیں ایسا اسٹائل ہاتھ آیا جو بذات خود جدید عربی نثر نگاری میں نیا ہے۔ جس میں مواد کی کثرت کے ساتھ ساتھ سلاست اور روانی کا پہلو کسی بھی مرحلہ میں کم نہیں ہونے پاتا۔ وہ جن موضوعات پر لکھتے ہیں سب سے پہلے ان پر غیر معمولی مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد ترتیب و تصنیف، کی ان کے یہاں زبردست پلاننگ ہوتی ہے۔ اس لیے جب تصنیف و تالیف میں ایک فکر سے دوسری فکر یا ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف وہ منتقل ہوتے ہیں تو راستہ میں کبھی بھٹکتے نہیں۔ ہو سکتا ہے پلاننگ کرنے میں ان سے کچھ غلطی ہوئی ہو اور وہ غلط نتیجہ پر پہنچے ہوں۔ ڈاکٹر شوقی ضیف نے قدیم و جدید دونوں موضوعات پر لکھا ہے جس میں ان کی ادبی صلاحیت پوری طرح جلوہ گر ہے لیکن ان کے قلم کی توانائی ان کی ان تصانیف میں پوری طرح منظر عام پر آئی جس میں انھوں نے مختلف ادوار کے ادبی و فکری رجحانات اور اسالیب بیان کا تجزیہ کیا ہے جن میں ادبی ذوق کے ساتھ تاریخ کا زبردست مطالعہ درکار ہوتا ہے۔ "الفن و مذاھبہ فی الشعر العربی" "الفن و مذاھبہ فی النثر العربی"، "الشعر الغنائی فی الامصار الاسلامیۃ"، "التطور والتجدید فی الشعر الاموی"، قابل ذکر ہیں۔

ہماری یہاں شوقی ضیف کی تصانیف اور ان کی علمی حیثیت بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ انھوں نے اپنی تصانیف میں زبان و بیان کے معیار کو کہاں تک باقی رکھا۔

شوقی ضیف نے عربی زبان وادب کے مختلف ادوار کا جس انداز میں جائزہ لیا ہے اُس میں ان کی عربی زبان وثقافت سے غیر معمولی لگاؤ و عقیدت مترشح ہوتی ہے۔ اپنی زبان وادب کو آگے بڑھانے کا جذبہ اپنے آباء واجداد کے کارناموں کو اچھی سے اچھی شکل میں پیش کرنے کی لگن ودھن ان کے طرز تحریر میں جدت اور رعنائی کی سبب بنی۔ آج تک ان کی علمی اور ادبی تخلیقات کا سلسلہ جاری ہے جو جدید عربی نثر نگاری کے لیے معاون ومحرک ہے۔

ڈاکٹر ناصر الدین الأسد: ڈاکٹر شوقی ضیف کے شاگردوں میں اردن کے مشہور محقق وادیب ڈاکٹر ناصر الدین الأسد ہیں۔ ان کے یہاں تصنیف وتالیف کا کوئی لمبا سلسلہ نہیں پایا جاتا لیکن اُن کے قلم سے جو تحریریں وجود میں آئی ہیں ان میں تصنیف وتالیف، تنقید وتحقیق، زبان وبیان کی تمام خصوصیات یکجا ہوگئی ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی کتاب مصادر الشعر الجاھلی کو عصر جدید کی اعلیٰ ترین کتابوں میں پیش کیا جا سکتا ہے، یہ کتاب اس نقطۂ نظر کی ایک تنقیدی کڑی ہے جس کو ڈاکٹر طہٰ حسین نے ۱۹۲۱ء میں پیش کیا تھا جو ان کی معرکۃ الآراء کتاب فی الشعر الجاھلی اور فی الادب الجاھلی کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ جس کی بناء پر ڈاکٹر طہٰ حسین کو عظیم الشان شہرت حاصل ہوئی اس نقطۂ نظر کی مخالفت اور موافقت میں بہت کچھ لکھا گیا جس کی بدولت ایک معیاری تنقیدی ادب وجود میں آیا۔ لیکن مخالفت یا موافقت کے جذبہ کے تحت جو بھی تحریر وجود میں آتی ہے اس میں سنجیدگی کے بجائے جذبات حاوی ہوتے ہیں، اور موضوعی طرز تحریر کے بجائے مبالغہ آمیز تحریر منظر عام پر آتی ہے۔ ڈاکٹر ناصر الدین الاسد نے اس نازک مسئلہ پر قلم اُٹھایا جس میں بڑی نزاکت تھی، لیکن انھوں نے اپنی اس کتاب میں جس علمی اور تنقیدی مہارت کا ثبوت دیا جو عام طور سے کہنہ مشق اہل قلم ہی دے سکتا ہے، حالانکہ یہ کتاب ان کی جوانی کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر ناصر الدین الأسد نے جاہلی ادب وشاعری کا موضوعی مطالعہ کیا، اور جو بھی تحریریں جاہلی ادب وشاعری کے سلسلہ میں قدیم اور جدید صحیفوں میں پائی جاتی تھیں ان کو انھوں نے کھنگال ڈالا اور پرکھا۔ یہاں تک کہ ان کو ایک لفظ بھی جاہلی شاعری کے سلسلہ میں دستیاب ہوا اس کو انھوں نے بڑی

اہمیت دی۔ اس کے بعد مستشرقین جنھوں نے تقریباً دو سو سال سے عربی ادب و ثقافت پر کام کیا اور اپنے علمی تجربوں اور نتائج کو قلم بند کیا اس کا بھی انھوں نے مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ میں حق کی تلاش اور علمی جستجو کارفرما رہی۔ اس سلسلہ میں جو بھی رائے یا نظریہ انھیں دستیاب ہوتا اس کو اپنی جھولی میں علمی سرمایہ سمجھ کر محفوظ کر لیتے جس طرح موتیوں کے متلاشی غواص کو ہر صدف میں اکر کی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ ناصر الدین الاسد نے اپنی اس کتاب کی تصنیف میں یہی نقطۂ نظر اپنے سامنے رکھا چنانچہ مواد اور معلومات کے بحر ذخار سے اپنا یہ تصنیفی عمل شروع کیا جس میں سنجیدگی اور گہرائی ہر قدم پر نظر آتی ہے، وہ متقدمین کے افعال و آراء کو یکجا کر کے ان میں جو رائے انھیں زیادہ مستند اور صحیح نظر آتی ہے اس کو اپنا لیتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے ایک ایسے مختلف فیہ اور نازک مسئلہ پر قلم اٹھایا جس کی منزل جتنی طویل ہے اتنی ہی دشوار۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس راہ کا مسافر منزلوں کی طوالت اور راہ کی دشواریوں سے نہ تو گھبراتا ہے اور نہ تھکتا ہے بلکہ منزل جتنی بھی لمبی ہوتی جاتی ہے اتنا ہی اس کو اپنے سفر میں فرحت اور لذت محسوس ہوتی ہے، اور منزل تک پہنچنے کے لیے وہ بے تاب و بے چین نہیں ہوتا بلکہ اس پر اس عاشق کی کیفیت طاری ہوتی ہے جو اپنی معشوقہ کے قدموں کے نشانات کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور ہر نشان اس کی ایک منزل ہوتا ہے جہاں اس کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور آگے کے نشان کا وہ شیدائی رہتا ہے اور اس کے قدم کہیں رکتے نہیں۔ اور طویل سے طویل راہوں اور پرخار وادیوں کو وہ وجد و کیف کے عالم میں طے کر لیتا ہے اور مشاہدہ کرنے والے اس کے جسم کے ہر حصہ پر غبار راہ دیکھتے ہیں لیکن اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرہ کی شگفتگی پر اس کا اثر بالکل نہیں نظر آتا۔ ناصر الدین الاسدی پہلی منزل جاہلی دور سے شروع ہوتی اور آخری منزل ڈاکٹر طٰہٰ حسین، شکیب ارسلان، زغلول پر ختم ہوئی اس راہ کے مسافر نے اپنی طویل منزل کے نشانات اور نتائج کو "مصادر الشعر الجاهلي" کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اس میں ان کا انداز بیان بڑا منطقی اور منطقی ہے۔ وہ جس طرح افکار و نظریات سے اچھانے میں

بڑے محتاط رہتے ہیں، اسی طرح الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی ترتیب میں بڑے حساس ہیں. اس لیے ان کے یہاں معلومات کی ترتیب کا بہت ہی نیا اور نرالا انداز ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ تالیف و تصنیف کے لمبے سفر میں معلومات اور جملوں کا محکم ربط ہونا چاہیے۔ اگر کسی مرحلہ میں بھی اس میں سقم پیدا ہو جائے اس وقت تصنیفی فن کی تمام بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کامیاب فنکار وہ ہے جو منزل کی طوالت سے گھبرانے کے بجائے آخری مرحلہ تک تیز گام رہا اور اس کی مسافتوں کو مسکراتے ہوئے سمیٹ لے بلکہ منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد بھی اس کا شوق جنوں باقی رہے۔ ناصر الدین الاسد اپنی اس کتاب میں ایک کامیاب محقق، ناخدا اور ادیب کے روپ میں علم و ادب کی دنیا میں روشناس ہوئے اور ان کی کتاب علمی دنیا میں ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گی۔ اور ان کا طرز بیان علم و ادب کے طالب گاروں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہے گا۔

محمد خلف اللہ

جدید دور کے ادیبوں اور انشا پردازوں میں محمد خلف اللہ بھی بہت اہم ہیں۔ ان کی تعلیم مصر اور انگلستان کی یونیورسٹیوں میں ہوئی، انھوں نے عربی ادب کے جدید اور قدیم موضوعات پر کام کیا۔ عربی زبان و ادب کے نشیب و فراز، مغربی ادب و ثقافت سے انھیں پوری واقفیت ہے۔ مصر کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی ادب کے استاذ رہے ہیں۔ تدریسی مشاغل کے ساتھ یونیورسٹیوں کے انتظامیہ میں کافی دخیل رہے ہیں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، تدریسی تجربہ کے ساتھ ساتھ ان کا تصنیفی عمل بھی ہمیشہ جاری رہا۔ ان کے قلم سے جو بھی تحریریں منظر عام پر آئیں علمی حلقوں میں ان کا بڑا خیر مقدم کیا گیا۔ ان کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ جب وہ کبھی کسی مسئلہ پر سوچنے یا غور کرنے ہیں اس وقت ان کا ذہن بالکل ایجابی ہوتا ہے۔ ان کا ذہن ہمیشہ اچھائیوں اور محاسن کی طرف جاتا ہے۔ چاہے وہ اشخاص پر بحث کریں یا افکار پر۔ ایسا لگتا ہے سمندر میں انھیں موتیوں کی تلاش زیادہ رہتی ہے، عربی ادب و ثقافت سے انھیں ایک طرح کا عشق ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی دور کا مطالعہ کرتے ہیں یا کسی مصنف کے فن کا جائزہ لیتے ہیں اس وقت ایسا لگتا ہے کہ ان کی آنکھوں سے محبت کی شعاعیں

پھوٹ رہی ہیں، اور ان کے قلم میں وجد و طرب کا عالم ہوتا ہے جس کا اثر ان کے ہر ہر لفظ میں پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کا بڑا تنوع ہے اور ہر موضوع پر ان کے قلم کی شوخی یکساں رہتی ہے، ان کی تصانیف میں 'معالم التطور الحدیث فی اللغۃ العربیۃ و آدابھا'، احمد فارس الشدیاق' بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ پہلی کتاب میں انھوں نے فرانسیسی حملے کے بعد مصر کی نثر نگاری میں جو اتار چڑھاؤ آیا ہے اس کی بڑی خوبی سے نشاندہی کی ہے، زبان کے ارتقائی مرحلوں کا تجزیہ و تحلیل کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ زبان کو نیچے سے اٹھا رہے۔ ان کا یہ اندازِ بیان ہر مرحلہ میں نمایاں رہتا ہے جو ان کے مزاج کا جزو بن گئی ہے۔ پروفیسر خلف اللہ کی تعلیم قدیم و جدید دونوں طریقوں سے ہوئی ہے۔ چنانچہ قدیم عربی متنوں کی قدر و قیمت متعین کرنے میں بہت کامیاب رہتے ہیں۔ اس طرح عرض و بیان میں جدید اصولوں کو بڑی خوبی سے برتتے ہیں۔ چنانچہ وہ جدید عربی نثر کے معماروں کی صف میں بڑی آسانی سے شامل ہو جاتے ہیں جن کے ذہن و فکر کی پرواز اور قلم کی رفتار سے عربی نثر نے اپنی طویل مسافت کو تھوڑے عرصہ میں طے کر لیا ہے۔ ان کی کتابیں 'الثقافۃ الاسلامیۃ والحیاۃ المعاصرۃ'، صاحب الاغانی'، 'علی مبارک و آثارہ'، 'الفن القصصی فی القرآن الکریم، محاضرات عن خفی ناصیف کا تبار باحثا'، جو مختلف اوقات میں چھپ کر منظر عام پر آئیں ان سے جدید نثر نگاری کی اٹھتی ہوئی سطح کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر عمر الدسوقی پروفیسر عمر الدسوقی کے سوچنے اور لکھنے کا تقریباً وہی انداز ہے جو محمد خلف اللہ کا ہے۔ دونوں کے مزاج میں یکسانیت اور دونوں کی تعلیم و تربیت بھی ایک ہی طرح کی تھی۔ عمر الدسوقی نے عربی زبان و ادب کی تعلیم قاہرہ یونیورسٹی کے کلیۃ دار العلوم میں پائی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گئے۔ لندن سے واپسی کے بعد تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اتفاق سے اپنی مادر علمی ہی میں عربی ادب کے استاذ مقرر ہوئے اور اس کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے رہے۔ وہ ایک کامیاب استاذ اور کامیاب مصنف ہیں، ایک استاذ کو اگر اپنے فن سے لگاؤ

وعقیدت پیدا ہو جائے تو نئے نئے موضوعات اس کے سامنے ابھر کر آتے ہیں اور ان ہی پر غور و خوض کرتے ہوئے اپنی ساری زندگی گذار دیتا ہے۔ اگر موضوعات کی آمد کے ساتھ پڑھنے اور مطالعہ کا سلسلہ جاری رہا تو ہر موضوع پر ایک نئی چیز لوگوں کے ہاتھ آتی ہے۔ عمر الدسوقی کلیۃ دار العلوم میں عربی زبان وادب کے استاد تھے۔ چنانچہ انھوں نے عربی ادب خواہ قدیم ہو یا جدید اس کا مطالعہ کیا۔ ان کا مطالعہ بڑا متنوع تھا۔ اس لیے ان کا تصنیفی عمل بھی بڑا متنوع ہے۔ ایک طرف النابغۃ الذبیانی پر لکھتے ہیں تو دوسری طرف محمود سامی البارودی پر بھی ان کا قلم رواں دواں نظر آتا ہے۔ ان کے قلم سے 'الفتوۃ عند العرب' منظر عام پر آئی تو المسرحیۃ اصولہا ونشأتہا' سے عربی نثر مالا مال ہوئی۔ الفتوۃ عند العرب کے لیے انھوں نے قدیم عربی زبان وادب کے اصول ومراجع کا مطالعہ کیا ہوگا تو المسرحیۃ اصولہا ونشأتہا کے سلسلہ میں مغربی ادب وثقافت کا مطالعہ بھی اسی شوق وانہماک سے کیا، اس کا اندازہ ان کی کتاب پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ عمر الدسوقی اشخاص وافکار کے تجزیہ و تحلیل کے وقت زمانی ومکانی عوامل ومحرکات کے سمجھنے پر کافی زور دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر زمانہ کے خد وخال زبان وادب کے آئینہ میں دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے، اور زبان وادب کے ارتقائی مراحل کو زمانہ کے عوامل ومحرکات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے، عمر الدسوقی اس پہلو پر بہت زور دیتے ہیں بلکہ اس میں کبھی مبالغہ کرنے لگتے ہیں جس سے اصل موضوع کبھی دب جاتا ہے بہر صورت ان کا یہ اپنا طریقۂ عرض وبیان ہے جس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک تصنیفی عمل کا تعلق ہے وہ ہر اعتبار سے مکمل رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے مواد کی فراہمی کا کام مکمل کر لیتے ہیں ان کے لکھنے کا انداز بڑا پیارا ہوتا ہے لکھنے میں وہ جلدی نہیں کرتے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ ہر جملہ پر وہ سوچتے اور آگے بڑھتے ہیں، ان کی تحریریں سادہ ہوتی ہیں لیکن ان میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہوتی ہے نفس موضوع سے استفادہ کے ساتھ ساتھ خوبی ان کے جملوں اور ترکیبوں میں ایک جدت ہوتی ہے۔ وہ مصطفیٰ صادق الرافعی اور احمد حسن الزیات

کی تحریروں سے بہت متاثر ہیں۔ چنانچہ معلومات کی کثرت اور ذہن کی پختگی کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں میں جو شگفتگی و رعنائی ہوتی ہے اس سے کتاب کی اہمیت اور وقعت اور بڑھ جاتی ہے۔ زبان کے مسئلہ میں ان کے یہاں لچک نہیں تھی، اس کے اصول و قواعد پر شدت سے عمل کرتے تھے، اور یہ حقیقت ہے کہ انھیں حضرات کی کوششوں اور ہمتوں کی وجہ سے عربی زبان حوادثات کا مقابلہ کرتی رہی اور ہر معرکہ میں اسے فتح مبین حاصل ہوئی۔ قدیم و جدید عامیہ اور فصحی کی خطرناک تحریکیں خود بخود ان حضرات کے عزائم راسخہ کے سامنے بجھ گئیں اور زبان کی صحیح سمت باقی رہی اور وہ اپنی ترقی کی منزلوں کو بڑے اطمینان سے طے کرتی رہی۔ ان کی کتابوں میں، 'فی الادب الحدیث'، 'دراسات ادبیۃ'، 'نشأۃ النثر الحدیث وتطورہ' ان تینوں کتابوں میں پروفیسر عمر الدسوقی نے جدید عربی ادب دبیان کے مختلف دھاروں کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا۔ ان کے ادبی و تنقیدی نظریات میں بڑی شدت ہوتی ہے لیکن اپنے فیصلہ میں بڑے محتاط رہتے ہیں۔ بہر صورت پروفیسر عمر الدسوقی جدید عربی ادب و ثقافت پر جس انداز میں اپنے خیالات و نظریات مرتب کیے ہیں ان میں عرض و بیان کے اعلیٰ اصول کے ساتھ ساتھ عمل تنقیدی میں بھی بڑے اچھے انداز میں منظر عام پر آئی جو عربی نثر کے ذخیرہ میں بہت اچھا

تنقیدی ادب: جدید عربی ادب میں تنقید نگاری کا فن بیسویں صدی کی ابتدا سے وجود میں آنے لگا اور آج تک سلسلہ برقرار ہے۔ اس فن میں پختگی اور گہرائی، ڈاکٹر طہٰ حسین، عباس محمود العقاد، عبد القادر مازنی، عبد الرحمٰن شکری، احمد امین، الزیات، احمد شائب کی محنتوں اور کاوشوں سے آئی۔ ان حضرات نے جس انداز میں تنقید نگاری کے اصول و ضوابط مرتب کیے تھے ان میں ہمہ جہتی کے ساتھ ساتھ دور اندیشی بھی پائی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے انھوں نے عربی زبان کے مزاج اور عصر حاضر کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا تھا۔ چنانچہ بعد کے تنقید نگاروں نے اس نہج پر چل کر تنقید نگاری کو آگے بڑھایا بلکہ اگر عدل و انصاف کی روشنی میں

دیکھا جائے تو اس صدی کی پانچویں دہائی کے بعد فن تنقید پر جو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں، موضوع کے اعتبار سے ابتدائی دور کے مصنفین کے مقابلہ میں زیادہ منظم اور فنی حیثیت سے زیادہ دقیع ہیں۔ ڈاکٹر مندور، پروفیسر یوسف عوض، ہلال غنیمی، پروفیسر عبدالقادر قسط، پروفیسر سید قلماوی نے اس فن کو آگے بڑھانے میں پیش پیش رہے ہیں۔ ان حضرات نے قدیم عربی ادب کے ذخیرہ میں جو کچھ بھی تھا اس کو بھی پڑھا، اس کے بعد دور جدید کے اساتذہ کی تحریروں سے بھی پوری طرح استفادہ کیا۔ جہاں تک مغربی زبانوں میں اس فن پر جو کام ہوا اس کا بھی گہرا مطالعہ تھا۔ بلکہ ان میں اکثر وبیشتر وہ حضرات ہیں جنھوں نے عرصہ تک کسی نہ کسی مغربی ملک میں قیام کیا اور اس فن کے اصول وکلیات کو پڑھا اور وہاں کے اساتذہ سے استفادہ کیا اور اپنے ملک واپس ہونے کے بعد ان کا تنقیدی مطالعہ جاری رہا اور وقتاً فوقتاً اس موضوع پر ان کی تصانیف منظر عام پر آتی رہیں، ان حضرات کے تنقیدی عمل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے عربی ادب میں مختلف موضوعات پر جو چیزیں وجود میں آئیں ان کا بھی جائزہ لیا۔ اس طرح جو بھی تحقیقی عمل وجود میں آیا اس کی قدر وقیمت سے لوگ واقف ہوئے۔ مثال کے طور پر یوسف عوض کی تصانیف "دراسات فی الادب والنقد، دراسات فی ادبنا الحدیث، دراسات فی النظم والمذاہب، المؤثرات الاجنبیۃ فی الادب العربی، ان تمام کتابوں عملی تنقید کے ساتھ ساتھ فن تنقید کا تفصیلی جائزہ۔ ڈاکٹر مندور کی تصانیف میں النقد المنہجی، الشعر بعد شوقی، پروفیسر سید قلماوی کی "محاضرات فی النقد الأدبی، النقد الادبی، ڈاکٹر ہلال غنیمی کی "النقد المقارن"، پروفیسر عبدالقادر قسط کی تنقیدی ادب کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اس کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان حضرات نے جدید عربی نثر نگاری کو فن تنقید کے مختلف موضوعات سے مالا مال کیا وہیں انھوں نے نوجوانوں کے ادبی ذوق واحساس میں جلا پیدا کی۔ ان کا تنقیدی عمل مغربی زبانوں سے ماخوذ نہیں ہے، بلکہ اس میں خود ان کے ذاتی احساسات وتجربات کارفرما ہیں۔ اگر نقاد اعلیٰ ادبی ذوق واحساس سے محروم ہو تو فن تنقید کا

مصنف تو ہو سکتا ہے لیکن ناقد نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے تصنیفی عمل کی ادبی دنیا میں کوئی وقعت ہوگی۔ کیونکہ وہ اپنے تجربات کے بجائے دوسروں کے احساسات و تجربات نقل کرتا ہے جن کا اس کی زبان و ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ عربی زبان کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ دور جدید میں فن تنقید میں جو ارتقاء ہوا اس کا سرا قدیم عربی نقد و بلاغت سے پوری طرح ہر مرحلہ میں مربوط رہا۔ جس کی وجہ سے عربی زبان و ادب کا تاریخی تسلسل برقرار رہتے ہوئے جدید سے جدید نظریات و رجحانات سے ہم آہنگ رہا۔

مصر کے ادیبوں کے علمی کارنامے دنیائے ادب میں زیادہ روشن رہے ہیں لیکن شام، لبنان اور عراق میں جو تنقیدی و تحقیقی کام ہو رہا ہے وہ کمیت اور کیفیت دونوں حیثیت سے قابل ستائش ہے اور اس علاقہ میں زبان و ادب کا معیار روز بروز اٹھتا ہے اور بڑھتا ہوا نظر آرہا ہے مثال کے طور پر شیخ عبدالقادر المغربی، طاہر الجزائری، علامہ کرد علی، شکیب ارسلان، خلیل مردم کے بعد ادیبوں نے اپنے اساتذہ کے معیار کو برقرار ہی نہیں رکھا بلکہ زبان و ادب کو زمانہ کے مطابق کافی آگے بڑھایا۔ ان کا تنقیدی ذوق ان کے مقابلہ میں زیادہ نکھرا ہوا نظر آتا ہے مثال کے طور پر، پروفیسر امجد الطرابلسی، ڈاکٹر شکری فیصل، سامی الدھان، شاکر فحام، محمد المبارک کے یہاں موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا ملکہ پوری طرح جلوہ گر ہے۔ لبنانی ادیبوں میں میخائیل نعیمہ، مارون عبود، جن کے تخلیقی و تنقیدی عمل کا سلسلہ بیسویں صدی کی ابتدا سے شروع ہوا اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ ان دونوں ادیبوں نے عربی نباہ و ادب کے ذخیرہ میں جو اضافے کیے ہیں اس نے عربی نثر نگاری کے ظاہر و باطن میں زندگی اور حرکت پیدا کر دی۔